آواز کا سفر

ایوب رومانی



موجد

آواز کا سفر

ایوب رومانی

مکتبۂ عالیہ — ایبک روڈ (انارکلی) — لاہور

اشاعت اوّل ۱۹۷۶ء

ناشر : محمد جمیل النبی
طابع : الطاف حسین
مطبع : ندرت پریس لاہور
سرورق : موجد
کتابت : ممتاز احمد

قیمت
-/۱۵

"آواز" کے نام ـــــــــ

پیش لفظ

ایوب رومانی، مزاج اور مشاغل کے لحاظ سے ایک جلوت نشیں شخصیت ہے مگر ایک شاعر کی حیثیت سے اس کی خلوت نشینی حیرت انگیز ہے۔ ایک ایسا شخص جسے جان محفل اور شمع انجمن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، آخر بحیثیت شاعر، محفلوں اور انجمنوں سے کتراتا کیوں ہے جبکہ اس کی غزل میں وہ تمام لطافتیں موجود ہیں جن سے اس دور کی غزل عبارت ہے؟ میں نے ایوب رومانی کی غزلوں کو اس مجموعے کے مسودے کی صورت میں دیکھا ہے تو میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہے اور اس کا اظہار میں نے اس لئے کر دیا ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ایوب رومانی کو میں نے چند مشاعروں میں ضرور سنا ہے مگر رسائل و جرائد میں پڑھا بہت کم ہے۔ اب اس کے تمام کلام کو یکجا پڑھا ہے تو میرا تاثر یہ ہے کہ اس نہایت ہی حساس اور نازک خیال شاعر کی گوشہ نشینی کا سبب محض تکلف یا صریح تغافل ہے۔ آخر ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو اپنے خداداد جوہر کا اظہار صرف اس لئے نہیں کرتے کہ کہیں لوگ انہیں خود اہمیتی کا طعنہ نہ دے دیں۔ ایوب رومانی بحیثیت شاعر انہی قلندر صفت لوگوں میں شامل معلوم ہوتا ہے۔

ایوب رومانی کی غزل میں کلاسکیت اور جدیدیت آپس میں یوں گھلی ملی ہوئی ہیں کہ انکی غزل کی روایت کی چوٹ مستقبل پر بھی پڑتی معلوم ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر غزل کو مستقبل میں بھی اسی شانِ دلآویزی کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو اسے ایسا ہی انداز اختیار کرنا ہوگا کہ وہ غزل بھی رہے اور عصر رواں کی نئی معنویتوں کو بھی اپنے اندر سموتی چلی جائے۔ غزل کی ایک

ہمیت تو معین ہی ہے لیکن جو چیزیں اسے جدید بناتی ہیں، ان میں اہم ایک تو موضوع کی ندرت اور صداقت ہے اور دوسرے غزل گو کا انفرادی لہجہ ہے۔ ایوب رومانی کے ہاں موضوع کی یہ ندرت و صداقت بھی ہے اور اس کا انفرادی لہجہ بھی جگہ جگہ صورت پذیر ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

بظاہر ایوب رومانی غمِ ذات کا اسیر ہے اور اس دور میں مشرق و مغرب کے سبھی شعراء یا تو اس غم کے آج بھی اسیر ہیں یا اسیر رہ چکے ہیں۔ دراصل جب کوئی شخص اپنے آپ کو فنی اظہار پر مجبور پاتا ہے تو سب سے پہلے اس کی نظر خود اپنی ذات پر پڑتی ہے۔ جوانی کے دنوں میں ہر شخص ویسے بھی نرگسیت میں مبتلا ہوتا ہے اور ہمہ وقت آئینہ اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ ذات کا اظہار کوئی گناہ نہیں ہے، انسانی فطرت کی مجبوری ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ شاعر کب اپنی ذات کے خول کو توڑ کر اپنے پیش نظر آئینے کی بجائے کائنات کو رکھنے کی جرأت کرتا ہے، یا وہ یہ جرأت کرتا بھی ہے یا نہیں۔ شاعر کی فنی زندگی کا یہ نہایت کڑا مرحلہ ہوتا ہے اور بہت سے شعراء ایسے ہیں جو اپنی ذات سے باہر بھی ذات کا کوئی رشتہ قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایوب رومانی کی غزلیں واضح طور پر اس امر کے ثبوت مہیا کر رہی ہیں کہ وہ غمِ ذات میں سے نکلنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ اس کے فن میں یہ نہایت خوشگوار تبدیلی رونما ہو رہی ہے، ورنہ ہمارے کتنے ہی شاعر ایسے ہیں کہ آج بھی ہر انسان کی آستین میں خنجر دیکھنے کے سوا کچھ دیکھ ہی نہیں پاتے اور پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں کی شاخوں پر انہیں پھولوں کی جگہ چڑیلوں کی آنکھیں لٹکتی نظر آتی رہتی ہیں۔

ایوب رومانی کے ہاں قدم قدم پر کھنڈر ہیں، ویرانیاں ہیں، اداسیاں ہیں، سناٹے ہیں شکستیں ہیں اور اس صورتِ حال کے ردِّ عمل دو ہی ہو سکتے ہیں۔ خودکشی یا تعمیرِ نو، ایوب کے ہاں تعمیرِ نو کا رجحان نمایاں ہے یہ رجحان صرف ان شعراء میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جو ذہنی طور پر توانا ہوتے ہیں اور جو نفی کے ماحول میں اثبات کے وجود سے منکر نہیں ہوتے۔ زبردستی کی رجائیت یقیناً کوئی کارنامہ نہیں ہے مگر زبردستی کی قنوطیت بھی تو خود مسلط کردہ خوف کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ ایوب رومانی کی رجائیت یا قنوطیت میں اپنے آپ کو جبر کے شکنجے میں کسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بے ساختگی سے شعر کہنے والوں میں یہ زبردستی ہوتی ہی نہیں۔

احمد ندیم قاسمی

گو ہمیں اپنا پتہ چلتا نہیں
دل کسی عالم میں بھی تنہا نہیں

تُو ہی تُو ہے اب نظر کے سامنے
میں کہاں ہوں کچھ پتہ چلتا نہیں

ایک آفت ہے دلِ شب زندہ دار
زلف کے سائے میں بھی سویا نہیں

میری مژگاں پر ہے اشکوں کا ہجوم
آسماں پر ایک بھی تارا نہیں

کتنی ویراں تیری آنکھیں ہو گئیں
اس قدر بھی جاگنا اچھا نہیں

جانے والے دل کو پتھر کر گئے
پھر کسی کو دیکھ کر دھڑکا نہیں

اب تو خود پہلو میں کانٹا ہے یہ دل
اب تو دل میں کوئی بھی کانٹا نہیں

ایک لمحہ عمر کی تصویر تھا
ڈوبنے والے نے کیا دیکھا نہیں

پاسِ خاطر اس قدر ایوبؔ تھا
سب سمجھ کر بھی میں کچھ سمجھا نہیں

پھر دُھواں دِل سے نکلتے دیکھا
رات بھر شہر کو جلتے دیکھا

تیری زُلفوں کی گھٹا سے ہم نے
کیا نیا چاند نکلتے دیکھا

عمر بھر جس نے حرارت بخشی
آج اُس دھوپ کو ڈھلتے دیکھا

آج اُن بھیگی ہوئی آنکھوں میں
اپنی تصویر کو جلتے دیکھا

کس نے دیکھا اثرِ نالۂ دل
کس نے پتھر کو پگھلتے دیکھا

کتنا تنہائی سے ہے پیار اُسے
کبھی گھر سے نہ نکلتے دیکھا

اپنے ہی سائے کو کل شب ایوّبؔ
اپنی باہوں میں مچلتے دیکھا

○

کب تھی اس دل کو بے کلی ایسی
شام سے کچھ ہوا چلی ایسی

کتنی یادوں کے سانپ ڈسنے لگے
دھوپ دیوار سے ڈھلی ایسی

شہر کا شہر ہو گیا برہم
بات پھیلی گلی گلی ایسی

اُن کی آنکھیں بھی ہو گئیں پُرنم
بات محفل میں کیا چلی ایسی

اُنس کومل سُروں کی سانس ترا
نغمگی لب کی گُن کلی ایسی

تیرگی اور بڑھ گئی دِل کی
آج تو شمعِ غم جلی ایسی

بھُول جاتے ہیں دو جہاں کے غم
یاد تیری ہے کچھ بھلی ایسی

کتنا بے باک ہے دلِ ایّوبؔ
اس کی ہر بات ہے ولی ایسی

دُعا بھی صرفِ شکایات ہوتی جاتی ہے
کچھ ایسی صورتِ حالات ہوتی جاتی ہے

وہ جن کی ایک ملاقات عمر کا حاصل
انہیں سے ترکِ ملاقات ہوتی جاتی ہے

نظر جو ملتی تھی پہلے، وہ اب نہیں ملتی
یہ بات کیا ہے، یہ کیا بات ہوتی جاتی ہے

ہوائے تیز میں کیسے چراغ لیکے چلیں
سفر طویل ہے اور رات ہوتی جاتی ہے

سنور رہی ہے وہی آگہی کے سانچوں میں
جو عمر نذرِ خرابات ہوتی جاتی ہے

وہ آرزو، جو تغافل کی گود میں کھیلی
ہلاکِ لطف و عنایات ہوتی جاتی ہے

کہاں سخن میں وہ پہلی سی چاشنی ایوبؔ
غزل بھی اب تو خرافات ہوتی جاتی ہے

اگرچہ دھوم جہاں میں تری وفا کی ہے
مگر یہ دل کہ توقع جسے وفا کی ہے

بس ایک ہم ہیں کہ الزام خود کو دیتے ہیں
وگرنہ ہر کوئی تقدیر ہی کا شاکی ہے

انہیں سے پوچھ لے کوئی کہ اُن پہ کیا گزری
لبِ خموش سے جب ہم نے التجا کی ہے

تمھاری یاد میں اکثر وہ وقت بھی آیا
خدا کو بھول گیا میں، قسم خدا کی ہے

یہ کیا کہ تجھ کو سمجھتا ہے ہر کوئی اپنا
سمجھ لیا تجھے اپنا، یہی خطا کی ہے

خُدا بھی کشتی و ساحل کے درمیاں نہ رہے
مرے خیال میں مرضی یہ ناخدا کی ہے

جہاں میں ہم کسے عیسیٰ نفس کہیں ایوبؔ
ہمارے درد کی کس نے یہاں دوا کی ہے

تجھ سے پہلے جو تمنّا تھی، وہی ہے اب تک
تجھ کو پا کر بھی کسی شے کی کمی ہے اب تک

تجھ سے مل کر بھی ترے ہجر کے صدمے نہ گئے
اس مسرّت میں بھی احساسِ غمی ہے اب تک

مجھ کو اب تک نہیں بھولا تری رخصت کا سماں
وہی تصویر ان آنکھوں میں بسی ہے اب تک

ہر نفس ایک جہنم کی تپش ہے لیکن
لب پہ آہوں کی وہی برف جمی ہے اب تک

ایسی تنہائی کہ آنسو بھی نہیں آنکھوں میں
اور یہ رات کہ تاروں سے بھری ہے اب تک

حاصلِ عمر یہی خواہشِ دل ہے یارو
لبِ اظہار پہ جو قرض رہی ہے اب تک

کس کو بتلائیں کہ ایوبؔ بڑی چیز تھے ہم
ہو گئے خاک مگر نام وہی ہے اب تک

رنگ تصویر سے چُراتا ہے
دل خود اپنی ہنسی اُڑاتا ہے

اس قدر کیوں قریب ہوتے ہو
فاصلہ اور بڑھتا جاتا ہے

آپ کی شکل یاد رہتی ہے
آپ کا نام بھول جاتا ہے

جانے کیوں رات بھر سرِ مژگاں
اِک ستارہ سا جھلملاتا ہے

دل میں اب نقشِ پائے غم بھی نہیں
اس خرابے میں کون آتا ہے

دیکھئے اب کے کوئے یاراں میں
پہلا پتّھر کدھر سے آتا ہے

صبرِ ایّوبؑ کی قسم، مجھ کو
تیرے وعدوں کا دھیان آتا ہے

رہگذاروں میں روشنی کے لئے
لے کے نکلے ہیں آندھیوں میں دیئے

ذائقہ تلخ ہے محبت کا
آدمی زہرِ غم پیئے نہ پیئے

دل میں یادوں کے رتجگے جیسے
ٹمٹماتے ہوں مرگھٹوں کے دیئے

دل میں طوفان ہیں چھپائے ہوئے
ہم کہ بیٹھے ہیں اپنے ہونٹ سیئے

کوئی تجھ سا نظر نہیں آتا
دل نے سو رنگ انتخاب کئے

دل کی دل میں رہیں تمنّائیں
آنکھوں آنکھوں میں کتنے اشک پیے

مُدّتوں دہر میں پھرے یارو
اپنے کاندھوں پہ اپنی لاش لئے

جان پیاری ہمیں بھی تھی ایّوبؔ
اپنی خاطر مگر کبھی نہ جیے

○

قریب آ گئی منزل ذرا ٹھہر جائیں
جنہیں گزرنا ہے وہ حادثے گزر جائیں

گھٹا جو چھائی ہے دل پر کبھی برس بھی چکے
یہ خشک آنکھیں کبھی آنسوؤں سے بھر جائیں

لگے ہیں کان تمہارے قدم کی آہٹ پر
سکوت وہ ہے کہ پتّہ ہلے تو ڈر جائیں

کوئی کرن جو لہو کی حرارتیں بخشے
کہیں ٹھٹھرتے ہوئے موسم میں ہم نہ مر جائیں

کبھی تو رات ہماری بھی چاندنی ہوگی
کبھی تو آئے گا وہ، کوئی دن ٹھہر جائیں

وہ زخم، تیرے کرم نے جو ہم کو بخشے ہیں
وہ زخم تیرے ستم سے کہیں نہ بھر جائیں

سکوت وہ ہے کہ پتّا بھی ہل نہیں سکتا
ہوا چلے تو سفینے بھی پار اُتر جائیں

کوئی تو ہوگا ہمارا بھی منتظر ایّوبؔ
چلو کہ رات اندھیری ہوئی ہے گھر جائیں

○

رُوکشِ آفتاب دیکھے ہیں
لوگ کچھ انتخاب دیکھے ہیں

دل کی دُنیا کبھی نہیں بدلی
گو کئی انقلاب دیکھے ہیں

اُس کے عارض پہ آنسوؤں کی نمی
پھول غرقِ شراب دیکھے ہیں

ہر نفس کی ہے خواہشِ دریا
ہر قدم پر سراب دیکھے ہیں

میں حقائق سے کیوں نہ گھبراؤں
عمر بھر میں نے خواب دیکھے ہیں

ہم نے دیکھا ہے آرزو کا مآل
دیدہ و دِل خراب دیکھے ہیں

وقت پر ہم نے دوست بھی ایّوبؔ
مائل اجتناب دیکھے ہیں

وفا پر کیا صبر اور مسکرائے
مگر پھر بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

جو مژگاں پہ چمکا تو دامن پہ ٹوٹا
ستارا نہ تھا جو فقط جگمگائے

یہ سب آگ انہی کی لگائی ہوئی ہے
وہ آنسو جو آنکھوں سے دامن پہ آئے

ہیں روٹھے ہوئے اُن سے اور منتظر ہیں
کوئی اب بُلائے، کوئی اب بُلائے

میں یاد آؤں اُن کو، مگر اس طرح سے
کہ احساس بھی اُن کو ہونے نہ پائے

یہ گلیاں اُسے یاد کرتی ہیں پیہم
الٰہی وہ خود راستہ بھول جائے

یہ مانا کہ ہے صبرِ ایّوب اک شے
کہاں تک مگر کوئی صدمے اُٹھائے

○

جنونِ عشق کی رسمِ کُہن جو عام کریں
غمِ جہاں کے بگولے ہمیں سلام کریں

سفر بھی دُور کا ہے، راستے بھی شعلہ فشاں
دکھائی دے کہیں سایۂ تو ہم قیام کریں

کبھی کسی کی نگاہوں سے گر نہیں سکتے
ہم اپنے آپ اگر اپنا احترام کریں

اُڑا کے لے گئی دنیا ورق ورق اُس کا
کتابِ دِل، جسے منسوب تیرے نام کریں

خدا کرے مری ناکامیوں کی عمر دراز
خدا کرے وہ مجھے دُور سے سلام کریں

فسانۂ غمِ ہستی نہ چھیڑ، رہنے دے
کہاں سے تجھکو سنائیں! کہاں تمام کریں

خود اپنی شاخِ نشیمن کو پھونک دیں ایوبؔ
جو ہو سکے تو چمن میں یہ رسم عام کریں

حالِ دل کہہ کر اُسے اندوہگیں کرتے رہے
اس طرح کچھ اور بھی اُس کو حسیں کرتے رہے

وہ نظر کی تشنگی تھی یا ہماری سادگی
زہر پر بھی ہم گمانِ انگبیں کرتے رہے

یاد کی جھیلوں میں وہ مہتاب بن کر آئیگا
زندگی کو اس تصوّر سے حسیں کرتے رہے

آپ کو دُنیا کے ہنگاموں سے کیا حاصل ہوا
خیر، ہم تو زندگی میں کچھ نہیں کرتے رہے

شہر کی دیوار سے سر پھوڑنے والے بہت
دشت کی آوارگی لیکن ہمیں کرتے رہے

تُو بھی اُن محنت کشوں پر تنگ ہو کر رہ گئی
تجھ کو جو سیراب خوں سے اے زمیں کرتے رہے

آنکھ سے ہوتی رہیں غم کی سلوں پر بارشیں
خون سے سرسبز پتھریلی زمیں کرتے رہے

زندگی ایوّب اُمیدوں پہ ہم نے کاٹ دی
وہ تو کیا آئے گا لیکن ہم یقیں کرتے رہے

○

دل میں کچھ درد سوا ہے یارو
آج رونا بھی روا ہے یارو

سانس لیتا ہوں تو دم گھٹتا ہے
کیسی بے درد ہوا ہے یارو

اتنی ویران نہ تھیں یہ آنکھیں
ضبط کرنے کا صِلہ ہے یارو

کس نے احساس کی دولت پائی
کون دیوانہ ہوا ہے یارو

اُس کے گیسوئے پریشاں کا خیال
دل سے کب دُور ہوا ہے یارو

اُسے بھولیں تو کبھی یاد کریں
وہ تو آنکھوں میں بسا ہے یارو

اپنے دامن میں کوئی پھول نہیں
دل میں کانٹا سا چبھا ہے یارو

خود پکارا اُسے خود دوڑ پڑے
خوب گنبد کی صدا ہے یارو

بے سبب احتمال سا کچھ ہے
آج دل کو ملال سا کچھ ہے

دل اُجڑ کر بحال سا کچھ ہے
ہجر میں اب وصال سا کچھ ہے

کوئی آیا تھا پُرسشِ غم کو
خواب سا کچھ، خیال سا کچھ ہے

زندگی ہم وفا شعاروں کی
اور کیا ہے، وبال سا کچھ ہے

تیرے تارِ نظر کا عکس نہ ہو
شیشۂ دل میں بال سا کچھ ہے

زندگی یوں کھڑی ہے تیرے حضور
جیسے لب پر سوال سا کچھ ہے

دل ہو یا دل کی آرزو ایوبؔ
جو بھی ہے پائمال سا کچھ ہے

دل سکوں پائے رات جاتی ہے
اب تو نیند آئے رات جاتی ہے

چاندنی کا نشاں نہیں باقی
گم ہوئے سائے رات جاتی ہے

شمع کی روشنی کو پروانہ
ڈھونڈ کر لائے رات جاتی ہے

تھک گئی ہے نظر ستاروں کی
تم نہیں آئے، رات جاتی ہے

کاش کھل کے وہ مجھ سے بات کرے
بھول بھی جائے رات جاتی ہے

عشرتِ وصل کو ثبات کہاں
آنکھ جھپکائے رات جاتی ہے

گہری تاریکیوں میں دل ایوبؔ
کون بہلائے رات جاتی ہے

یہ کیا ہوا کہ بے سرو ساماں نہیں رہے
اب ہم تمہاری شان کے شایاں نہیں رہے

دل میں لہو کی بوند بھی باقی نہیں رہی
سینے میں آرزوؤں کے طوفاں نہیں رہے

اپنے لہو سے آپ جلائی ہیں مشعلیں
ہم پر کسی بھی چاند کے احساں نہیں رہے

سینے میں روشنی بھی انہیں کے سبب سے ہے
جو داغ دیکھنے میں نمایاں نہیں رہے

شامِ فراق نے وہ نکالی ہیں حسرتیں
دل میں طلوعِ صبح کے ارماں نہیں رہے

وہ شمع تھی کہ تابہ سحر روشنی رہی
پروانے ایک پل بھی فروزاں نہیں رہے

انسانیت سے جن کو ملا تھا شرف، وہ لوگ
کچھ اور ہوگئے مگر انساں نہیں رہے

تُو ہی بتا کہ دیکھنے والوں نے کیا کہا
کیا ہم تری نظر سے نمایاں نہیں رہے

اب دشتِ بے مراد کی وسعت ہے اور ہم
اب آمدِ بہار کے امکاں نہیں رہے

غم کا احساس خام ہے شاید
دل ابھی شاد کام ہے شاید

ہائے، تو اور پھر جُدا مجھ سے
وقت کا انتقام ہے شاید

دل میں اب درد بھی نہیں اُٹھتا
یہ ترا احترام ہے شاید

"تھم گئیں گردشیں زمانے کی"
کوئی محوِ خرام ہے شاید

درد ہی درد دل میں رہتا ہے
درد کا دِل مقام ہے شاید

تُو مری تشنگی پہ طعنہ زن
تیرے ہاتھوں میں جام ہے شاید

یہ تلوّن حیات کا ایّوبؔ
گردشِ صبح و شام ہے شاید

○

خواہشیں ہوتی نہیں اور ہاتھ اُٹھا دیتے ہیں لوگ
بے سبب بھی آسمانوں کو صدا دیتے ہیں لوگ

سب کی آنکھوں میں ہوس کا رنگ ہے یہ سوچ کر
ننگی تصویریں نمائش میں لگا دیتے ہیں لوگ

کانچ کے شوکیس میں پہنا کے بھڑکیلے لباس
کاٹھ کے پتلے دکانوں میں سجا دیتے ہیں لوگ

سستی شہرت ہاتھ لگ جاتی ہے تو پھر جابجا
اپنے اپنے نام کے کتبے لگا دیتے ہیں لوگ

یاد کی مشعل سے یارو رات کے پچھلے پہر
آگ میرے دل کی بستی میں لگا دیتے ہیں لوگ

کیا کرے گا کھینچ کر انصاف کی زنجیر کو
جرم کوئی ہو نہ ہو لیکن سزا دیتے ہیں لوگ

دیکھنے والے یہ سمجھیں گھر میں رہتا ہے کوئی
رکھ کے دروازے کھلے دھوکا کھلا دیتے ہیں لوگ

ٹھوکر لگی ہے وہ کہ سنبھلنا پڑا مجھے
خود کو نئے سرے سے بدلنا پڑا مجھے

یہ تو ہُوا کہ جسم کو کُندن بنا لیا
گو اپنے گھر کی آگ میں جلنا پڑا مجھے

جو پا لیا ہے اب اُسے کھونے کے واسطے
میدانِ جستجو میں نکلنا پڑا مجھے

آواز جب بھی دی مجھے پیاسی زمین نے
جوں چشمہ پتھروں سے اُبلنا پڑا مجھے

کچھ اس طرح تھی پاؤں میں زنجیرِ بے بسی
رہزن کے ساتھ ساتھ بھی چلنا پڑا مجھے

میرے لہو نے توڑ دیا ابر کا حصار
سورج تھا میں، شفق سے نکلنا پڑا مجھے

اب کے ہوئی شکست مجھے اپنے ہاتھ سے
اب کے لباسِ زخم بدلنا پڑا مجھے

ایوبؔ، کاٹنا تھی سنہری سَروں کی فصل
تلوار بن کے اس لئے چلنا پڑا مجھے

جب بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا
بزمِ گُل چھوڑ گیا، دل مرا پاگل نکلا

جب اُسے ڈھونڈنے نکلے تو نشاں تک نہ ملا
دل میں موجود رہا آنکھ سے اوجھل نکلا

اک ملاقات تھی جو دل کو سدا یاد رہی
ہم جسے عمر سمجھتے تھے وہ اک پل نکلا

وہ جو افسانۂ غم سُن کے ہنسا کرتے تھے
اتنا روئے ہیں کہ سب آنکھ کا کاجل نکلا

رنگ بدلا بھی، مگر تیرگیٔ شب نہ گئی
ہم جسے چاند سمجھتے تھے وہ بادل نکلا

ہم سکوں ڈھونڈنے نکلے تھے، پریشان رہے
شہر تو شہر ہے، جنگل بھی نہ جنگل نکلا

کون ایوبؔ پریشاں نہیں تاریکی میں
چاند افلاک پہ، دل سینے میں بیکل نکلا

ساتھ اُن کے گزرے ہوئے لمحے جب بھی ہمیں یاد آتے ہیں
صبر و سکوں کے لاکھ سفینے اشکوں میں بہہ جاتے ہیں

کل ہم اُن کو دیکھ کے کیا کیا خوش ہوتے تھے، لیکن اب
اُن کا تصوّر بھی آئے تو آنکھ میں آنسو آتے ہیں

میری بربادی کا باعث، میرے ہی حالات ہوئے
آپ کا اسمیں دوش ہی کیا ہے، آپ عبث غم کھاتے ہیں

دیوانہ دیوانہ کہنا فرزانوں کی عادت ہے
عشق کی دنیا میں فرزانے، دیوانے کہلاتے ہیں

عشق ہمارے دھیان پڑا ہے، چین سے کیا، آرام سے کیا
پاگل ہیں سمجھانے والے، ہم کو عبث سمجھاتے ہیں

آخر ان کی قیمت کیا ہے آپ ہی کچھ انصاف کریں
وہ آنسو جو آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم پی جاتے ہیں

محفل میں ایوبؔ یہ اُن کی طرزِ ادا دیکھے تو کوئی
چور چھپا ہے اپنے دل میں، ہم سے آنکھ چراتے ہیں

○

یہ کون جھانک رہا ہے گئی رُتوں سے مجھے
صدائیں آتی ہیں احساس کی حدوں سے مجھے

کھُلی جو آنکھ تو آنکھیں بچھا رہے تھے وہی
گزار رہے تھے جو خوابوں میں پربتوں سے مجھے

کسی بھی جسم کی خوشبو مشامِ جاں نہ بنی
بنانی پڑ گئی تصویر واہموں سے مجھے

میں اس خیال سے اُس کی گلی میں جا نکلا
کہ اُس نے دیکھا نہیں ہے کئی دنوں سے مجھے

جگہ نہ دیجئے شیشے میں بال کی صورت
نکال دیجئے شک کی طرح دلوں سے مجھے

اُبھر کے سطح پہ آیا تو ہاتھ خالی تھے
ملا نہ کوئی بھی موتی سمندروں سے مجھے

اُبھر رہے ہیں مرے دل پہ عکس یادوں کے
دبا دیا ہے کسی نے امانتوں سے مجھے

نہ پھول ہاتھ میں آتے نہ خار دامن میں
ملی نہ کوئی بھی سوغات موسموں سے مجھے

راکھ ہوئے سب خواب سہانے آگ لگی تعبیروں میں
دل اب کس کو ڈھونڈ رہا ہے جلی ہوئی تصویروں میں

لوگ ہمارے شعروں کے کچھ یوں ہی تو مداح نہیں
ہم نے دل کا درد سمویا ہے اپنی تحریروں میں

اس کے ہاتھ کمان آئی تو کیا کیا میرے بل نکلے
دیکھو کیسا تیر ہوا ہے جسم الجھ کر تیروں میں

ایک وفا کا پیکر اور اک اپنے وقت کا ہرجائی
فرق فقط اتنا ہے دونوں اِک جیسی تصویروں میں

جیسے پہلے وقت کٹا ہے باقی بھی کٹ جائیگا
لوگ اُلجھتے رہ جائیں گے تخریبوں تعمیروں میں

دل پر کاری زخم ہیں لیکن کبھی تو بھر ہی جائیں گے
بندھا رہے گا کوئی کب تک یادوں کی زنجیروں میں

اب اُس دور کا ذکر ہی کیا جب ہر سُو اپنا چرچا تھا
شامل ہم ایوّبؔ ہیں اب تو مست الست فقیروں میں

وہ جو ہم سے عداوتیں رکھے
دل اُسی سے محبتیں رکھے

روٹھتا ہے تو روٹھ جانے دو
وہ تو سب سے شکایتیں رکھے

صرف یہ سوچ کر اسے نہ ملے
کون اتنی رقابتیں رکھے

ہم تو اک پل نہ رہ سکیں ناراض
وہ مہینوں کدورتیں رکھے

ذہن کب کہہ سکا اسے اپنا
دل تو بیکار قربتیں رکھے

ہم جسے دیکھ کر جئیں ایوبؔ
وہ ہمیں سے عداوتیں رکھے

خواہشیں ساتھ ساتھ چلنے کی
عادتیں راستے بدلنے کی

میں نے کوشش تو بارہا کی ہے
ذات کے کرب سے نکلنے کی

ایک مدت سے رُت نہیں دیکھی
صبح ہونے کی شام ڈھلنے کی

وہ جُدا ہو گیا سدا کے لئے
اب نہیں زندگی سنبھلنے کی

آس کا پھول، یاد کا گلشن
اور صدا، آندھیوں کے چلنے کی

یاد آئے گی ایک مدت تک
وہ تباہی جو ایک پل نے کی

مجھ کو عادت ہے آج کل ایوبؔ
اپنے نقشِ قدم پہ چلنے کی

زمیں کو کیسے نہ سمجھوں میں آسماں کی طرح
تری گلی کے تو ذرّے ہیں آسماں کی طرح

جسے بچھڑنا ہے وہ آج ہی بچھڑ جائے
ابھی تو ذہن میں ہیں صورتیں گماں کی طرح

وہ ایک شخص کہ میرا نہ بن سکے گا کبھی
مگر ملا ہے ہمیشہ ہی مہرباں کی طرح

میں اُس کو ڈھونڈنے نکلوں تو وہ کہیں نہ ملے
عزیز جس کا تصوّر ہے مجھ کو جاں کی طرح

بچھڑنا اُس کا نہ پھر ہم سے دیکھا جائے گا
اُسے کہو نہ ملے ہم سے مہرباں کی طرح

ہر ایک ہاتھ میں ہوں اشتہار کی صورت
ہر ایک ذہن میں ہوں لوک داستاں کی طرح

کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں وہ ساعتیں ایوبؔ
جو رہ گئی ہیں کہیں گردِ کارواں کی طرح

سورج کا آسمان پہ پرچم کھلا نہیں
شب کٹ چکی ہے اور سویرا ہوا نہیں

اب میری چاپ پر نہیں کھلتا کوئی کواڑ
اب روزنوں سے کوئی مجھے جھانکتا نہیں

جس پھول کی طلب ہے تری زلف کے لئے
وہ تو کسی بھی شاخ پہ اب تک کھلا نہیں

دھارا نہ میری آنکھ نے موسم کا کوئی روپ
چہرہ کسی نقاب میں اب تک چھپا نہیں

کر دے نہ مجھ کو راہ میں پتھر کوئی صدا
اس خوف سے میں مُڑ کے کبھی دیکھتا نہیں

چاروں طرف سے، شہر میں میلہ لگا ہوا
وہ بھیڑ ہے کہ کوئی بھی پہچانتا نہیں

میں سوچتا ہوں کیوں مجھے ٹھوکر لگی ہے آج
میں تو کسی کی راہ کا پتھر بنا نہیں

ویران ہو گئے مری آنکھوں کے رتجگے
راتوں کو جاگنے کا بھی کوئی صلہ نہیں

ایوبؔ کِس زباں سے اُسے بیوفا کہوں
میرا بھی ہو کے جو کبھی میرا ہوا نہیں

خود کو منوانے کا یہ ڈھنگ نکالا ہم نے
جو نہ محسوس کیا شعر میں ڈھالا ہم نے

دیر تک کچھ نظر آیا نہ اندھیرے کے سوا
جیسے دیکھا ہو کوئی نور کا ہالہ ہم نے

رات گزری تو پلٹ آئیں گھٹائیں کالی
دن نکلنے پہ بھی دیکھا نہ اُجالا ہم نے

جس طرح کانچ کی نازک سی کوئی گڑیا ہو
یوں تری یاد کو اک عمر سنبھالا ہم نے

ہم نے تنہائی سے تنگ آ کے محبت کی تھی
اب پشیماں ہیں کیوں روگ یہ پالا ہم نے

○

جو نبھ نہ سکتے تھے رکھے وہ سلسلے ہی کیوں
یہ دکھ رہے گا کہ اُس شخص سے ملے ہی کیوں

ہمیں یہ دکھ کہ ملے بھی تو حال کہہ نہ سکے
مگر اُسے یہ شکایت کہ لب ہلے ہی کیوں

کسی کی زُلف میں مہکے، نہ تربتوں پہ پڑے
میں سوچتا ہوں کہ آخر یہ گُل کھِلے ہی کیوں

ہم اپنے عہد کے لوگوں سے مختلف تو نہیں
تو پھر ہمیں سے ہر اک شخص کو گِلے ہی کیوں

سُنا ہے اب کے برس پھر بہار آئے گی
یہ چاک چاک گریبان پھر سِلے ہی کیوں

○

شہر سنسان ہے خوابوں سے جگائیں کس کو
کس لئے جاگ رہے ہیں یہ بتائیں کس کو

ہم سفر کوئی نہیں ہے ترا سائے کے سوا
دشتِ تنہائی میں دیتا ہے صدائیں کس کو

سب ہیں بے تاب سمٹنے کو کھلی بانہوں میں
کس کو ناراض کریں اور منائیں کس کو

اب تو ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں دیوانہ کوئی
لوگ بازار میں پتھر سے ڈرائیں کس کو

سامنے آتے ہیں سب وہم کے پیکر بن کر
کس کو محسوس کریں، ہاتھ لگائیں کس کو

دل میں سو رنگ کی تصویر ہے احساس نہیں
دوستو نقش پہ دیوار بنائیں کس کو

کوئی تنکا بھی سہارا نہیں دیتا ایوبؔ
سیلِ جذبات میں دیوار بنائیں کس کو

ہر گھڑی ذہن پہ کیوں خوف کے تالے رکھنا
یہ بھی کیا، خود کو تذبذب ہی میں ڈالے رکھنا

میری رُسوائی کا باعث ہے تری رُسوائی
مجھ پہ تہمت نہ مرے چاہنے والے رکھنا

جن کو معلوم نہیں قدرِ لبِ گویا کی
ایسے لوگوں میں درِ لفظ پہ تالے رکھنا

تیرا سرمایہ کہیں دیکھ کوئی لوٹ نہ لے
خواب آنکھوں کی امانت ہیں سنبھالے رکھنا

آنکھ میں جاتی ہوئی شب کا رہے لاکھ اثر
ذہن میں آتے ہوئے دن کے اُجالے رکھنا

بہہ نہ جانا کہیں جذبات کے طوفانوں میں
چاہے وہ کچھ بھی کہے دل کو سنبھالے رکھنا

چاہے وہ دشت میں نکلے کہ نگر میں ایوبؔ
چاند کا کام ہے راتوں کو اُجالے رکھنا

کیا تھا شعر میں ذکر اُس کے عارض و لب کا
وہ ایک شخص کہ محبوب ہو گیا سب کا

اب اُس کا نام و نشاں پوچھتے ہو کیا مجھ سے
مجھے تو اُس نے فراموش کر دیا کب کا

وہ دوستوں کو بدلتا ہے فیشنوں کی طرح
لبادہ چاہیئے اُس کو تو اپنے مطلب کا

لباس میں بھی برہنہ ہے اس کا سارا بدن
بنا ہے شہر میں وہ مرکزِ ہوس سب کا

وہ سایہ سایہ شعاعیں پہن کے پھرتا ہو
نظارہ کون کرے اُس کی تاب اور تب کا

میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں ایک عمر کے بعد
مرے مزاج کا تُو تھا نہ میں ترے ڈھب کا

ہمیں تو دُھوپ سے چہروں نے ڈس لیا ایوبؔ
جہاں میں نام ہے بدنام ظلمتِ شب کا

○

ایک قطرہ بھی لہو کا دیدۂ تر میں نہیں
سُرخیاں منظر میں ہیں آنکھوں کے پتھر میں نہیں

آنکھ کی مانند میرا دل بھی ہے اُجڑا ہوا
دوستو اب کوئی بھی تصویر اس گھر میں نہیں

ذہن کے تاریک پردے پر نہیں صورت کوئی
روشنی کی اک کرن بھی روزنِ در میں نہیں

سر پہ اب ہوتی نہیں ہیں پتھروں کی بارشیں
رسم پہلی سی کوئی شہرِ ستمگر میں نہیں

اب یہاں دستک نہ دے اے صبح کی پہلی کرن
گھر سے جو باہر نکلتا تھا وہ اب گھر میں نہیں

کس کو پہناتی نہیں رستوں نے زنجیرِ سفر
کون ایسا ہے کہ جو منزل کے چکّر میں نہیں

کیا کرے گا تو اُتر کر آنکھ کی گہرائی میں
تیرے حصّے کا کوئی موتی سمندر میں نہیں

خاک میں ایوبؔ کیا جوہر ہے، اُن سے پوچھیے
جن کی آنکھوں کے لئے کوئی کشش زر میں نہیں

○

ذہن میں اُلجھے ہوئے تھے ریشمی دھاگے بہت
رات ہم تڑپے بہت روئے بہت جاگے بہت

جو نہ ہونا تھا ہُوا اس روشنی کے دور میں
دھوپ پیچھے رہ گئی سائے گئے آگے بہت

نیند میں کھوئے ہوئے لوگوں کی قسمت جاگ اُٹھی
بے سبب ہم اس شبِ تاریک میں جاگے بہت

اک جہانِ امن بھی آباد ہے اس دہر میں
آگہی سے ماورا، ادراک سے آگے بہت

اس کا کیا کیجے کہ اک لمحہ نہ واپس لا سکے
اپنے ہی سائے کے پیچھے رات دن بھاگے بہت

آنکھ کی پُتلی میں کوئی عکس بھی باقی نہیں
جا چکا ہے کارواں یادوں سے بھی آگے بہت

انتظارِ خواب میں آنکھیں ہمیشہ وا رہیں
نیند کی حسرت میں اے ایوبؔ ہم جاگے بہت

○

کوئی تہمت، کوئی الزام، کوئی چھاپ لگے
پھر نہ کہنا مری رسوائی کو پر آپ لگے

ایک میں ہوں کہ پشیماں ہوں بھلائی کر کے
ہائے وہ لوگ مرے پُن بھی جنہیں پاپ لگے

میں گزرتا گیا پہنے ہوئے رسوائی کے ہار
لوگ دیکھا کئے دروازوں سے چپ چاپ لگے

دشتِ وحشت میں کئی بار پکارا خود کو
اجنبی اپنی ہی آواز کو ہم آپ لگے

دھیان بٹ جائیگا آہٹ پہ اگر کان دھرے
غیر مانوس نہ کیوں اُس کو میری چاپ لگے

دل بھی اب بیٹھ چلا صرف بلمپت سُن کر
چھنکے پائل کوئی، ڈھولک پہ کوئی تھاپ لگے

دُھندلی دُھندلی سی ہر اک شکل ہے ایوبؔ یہاں
آئینے سامنے آئے بھی مگر بھاپ لگے

○

نقشِ صدا فضا میں کوئی آن تو رہے
یُوں گنگنا کہ راگ کی پہچان تو رہے

آنکھوں میں آس ہے نہ ترے دل میں خواہشیں
خالی گھروں میں آنے سے مہمان تو رہے

گو خاک ہو گئے ہیں مگر اس کے باوجود
ہم لوگ عزّتوں کے نگہبان تو رہے

آنکھیں اُجاڑ نیند کو ترسیں مری طرح
میرے لئے بھی کوئی پریشان تو رہے

تصویر وہ بنا کہ نمائش میں ہر کوئی
کچھ دیر اس کو دیکھ کے حیران تو رہے

کچھ بھی نہ ہاتھ آئے گا تصویر چوم کر
اس طرح پورے ہونے سے ارمان تو رہے

کر لی ہے صلح وقت سے ایوبؔ اس لئے
محفوظ اس سے میرا گریبان تو رہے

○

وقت کے چہرے سے جب پردہ اُلٹ جائے گا
یاد کا لمحہ کئی لمحوں میں بٹ جائے گا

میں نے اِک عمر سے جھپکی نہیں اس خوف سے آنکھ
اُس کا چہرہ مری نظروں سے اُچٹ جائے گا

خوفِ تنہائی سے یوں لوگ لرز جائیں گے
اپنے ہی سینے سے ہر شخص چمٹ جائے گا

آج کی رات اُترتے ہی مرے آنگن میں
چاند تنہائی کی تلوار سے کٹ جائے گا

اس کڑی دھوپ میں کھڑکی نہ کھلے گی کوئی
میرا سایہ میرے قدموں میں سمٹ جائے گا

آنکھ ویران ہے مدّت سے بیاباں کی طرح
جو بھی اس راہ سے گزرا وہی اَٹ جائے گا

عکس میں اپنا سمجھتا تھا جسے وہ ایّوبؔ
کیا خبر تھی کہ مرے سامنے ڈٹ جائے گا

اب دیکھتا ہے کیا مری آنکھوں کے رنگ کو
سینے میں دفن میں نے کیا ہر اُمنگ کو

آئے گا کوئی ہاتھ میں سُورج لئے ہوئے
اک روشنی مٹائے گی سینوں کے زنگ کو

جن کے سروں پہ کاغذی پھُولوں کے تاج تھے
وہ رو رہے ہیں بیٹھ کے اب نام و ننگ کو

بڑھتا ہے کس کی سمت سے اب دوستی کا ہاتھ
تبدیل کون صلح میں کرتا ہے جنگ کو

کیوں زرد پڑ گئے ہیں حسیں خواہشوں کے پھول
کیا ہو گیا ہے جانے لہو کی ترنگ کو

اک ہم کہ پتھروں سے ہوتے ہیں لہو لہو
اک تم، انگوٹھیوں میں سجاتے ہو سنگ کو

خود کر دیا ہے زیست کو حالات کے سپرد
ہاتھوں سے خود ہی توڑ دیا ہے پتنگ کو

نازک دلوں سے درد کا احساس چھین لے
تصویر سے نکال لے ایوبؔ رنگ کو

---

(۱)

ہر شخص تو خُدا ہی نہ بن کر مِلا کرے
کوئی تو اپنی ذات سے باہر مِلا کرے

وہ بھی مری طرح سے اکیلا ہے شہر میں
ویران راستوں پہ جو اکثر مِلا کرے

تاریک کر گیا وہ مری خواہشوں کا شہر
چہرے پہ جس کے صبح کا منظر مِلا کرے

یارو ، تکلفّات کے قائل نہیں ہیں ہم
ہم سے جسے بھی ملنا ہو کھُل کر مِلا کرے

ہے کِس قدر عزیز ہمیں، کچھ نہ پوچھئے
وہ دل کہ جس میں درد برابر رِلا کرے

کس کس سے اُس نے گانٹھ رکھی ہے جہان میں
ہم سے بھی کوئی دم تو ستمگر رِلا کرے

ملنے کی آرزو ہو تو ملتا نہیں کہیں
ایوبؔ ، ہم سے یوں تو وہ اکثر رِلا کرے

آپ ہی ہنسنے لگا میں، آپ ہی رونے لگا
عشق میں آخر جو ہونا تھا، وہی ہونے لگا

شب گزر کر جاگتی آنکھوں کو لالی دے گئی
قطرۂ شبنم ڈھلک کر میرا مُنہ دھونے لگا

میری حالت دیکھ کے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے
ان کے آگے میں بھی بچوں کی طرح رونے لگا

مُجھ کو بے خُود کر نہیں سکتی مُغنّی کی صدا
اب تو میں اپنی خموشی ہی میں گم ہونے لگا

رونقیں جتنی تھیں وہ تنہائیوں نے چاٹ لیں
ہنستا بستا آرزو کا گھر کھنڈر ہونے لگا

ہوتے ہوتے دیدہ و دل کو بھی نیند آنے لگی
رفتہ رفتہ درد کا احساس بھی سونے لگا

اب کے شاید آنسوؤں کی فصل کاٹی جائیگی
ہر کوئی ایوبؔ دل میں نفرتیں بونے لگا

○

دل کے پتھّر نے مری آنکھ بھی چھلکائی ہے
سطحِ دریا پہ بھی گہرائی اُبھر آئی ہے

مجھ کو سُورج کی طلب، اس کو ستاروں کی تلاش
چاند کے ہاتھ میں بھی مشعلِ تنہائی ہے

جب بھی گزرا ہوں ترے شہر کے بازاروں سے
سنگ ہاتھوں میں لیے بِھیڑ نکل آئی ہے

میں کہ اک عمر کڑی دھوپ میں آوارہ پھرا
تب کہیں ہاتھ مرے ایک کرن آئی ہے

مل گیا آج اُسے ہاتھ لگانے کا صِلہ
برف کے نیچے سے چنگاری نکل آئی ہے

دل کی بستی پہ بھی صحرا کا گماں ہوتا ہے
ہر طرف دُھول ہے، سنّاٹا ہے، تنہائی ہے

میں اندھیروں کا پرستار نہیں ہوں، لیکن
روشنی میرے لئے باعثِ رُسوائی ہے

پھر سرِ بزم لٹاتا ہے خرد کے موتی
وہی ایوبؔ جو دیوانہ ہے سودائی ہے

سنگدل ہوں اسقدر، آنکھیں بھگو سکتا نہیں
میں کہ پتھریلی زمیں میں پھول بو سکتا نہیں

ایک دو دُکھ ہوں تو پھر ان سے کروں جی بھر کے پیار
سب کو سینے سے لگا لوں، یہ تو ہو سکتا نہیں

لگ چکے دامن پہ اپنے اتنے رسوائی کے داغ
ان کو آنسو کیا، سمندر تک بھی دھو سکتا نہیں

تیری بربادی پہ میں آنسو بہاؤں کس طرح
میں تو خود اپنی تباہی پر بھی رو سکتا نہیں

ہر کوئی شامل ہے اس کے حلقۂ احباب میں
دوستو! وہ تو کسی کا دوست ہو سکتا نہیں

میں ترے در کا بھکاری تو مرے در کا فقیر
آدمی اس دور میں خوددار ہو سکتا نہیں

اس کی کیوں خواہش کروں جسکا نتیجہ کچھ نہ ہو
دُودھ کی صورت کوئی پانی بلو سکتا نہیں

خواہشوں کی نذر کیوں ایوبؔ کر دوں زندگی
کچّے دھاگے میں کوئی موتی پرو سکتا نہیں

کیوں اس سے خوف کھاؤں کہ سُورج بلا کا ہے
اے دوست! میرے سر پہ تو سایہ خدا کا ہے

منزل وہی بنی کہ جہاں رکھ دیا قدم
ہر مرحلہ اسیر مرے نقشِ پا کا ہے

مُجھ سے نظر ملائے، مرے سامنے تو آئے
وہ شخص، جس کی آنکھ میں جادو بلا کا ہے

کیوں پھُول جل رہے ہیں، مجھے یہ بتائیے
یہ تو بجا کہ راج چمن میں صبا کا ہے

مُجرم ہوں اپنے دل کی عدالت کے رُوبرو
امید ہے رہائی کی، ڈر بھی سزا کا ہے

یہ اور بات، میرے مقدّر میں ہیں فریب
ورنہ وہ دیکھنے میں تو پیکرِ وفا کا ہے

ہر بار اُس نے دی ہیں درِ دل پہ دستکیں
ہر بار میں نے سمجھا کہ جھونکا ہوا کا ہے

ایّوبؔ حسن و عشق ہیں قانون کے اسیر
دل کا معاملہ بھی تو جُرم و سزا کا ہے

کیا ہے اگر وہ شخص تماشائیوں میں تھا
تُو بھی تو اپنے وقت کے ہرجائیوں میں تھا

اک وقت یہ کہ تُو مجھے پہچانتا نہیں
اک وقت تھا کہ تُو مرے سودائیوں میں تھا

مُڑ مُڑ کے سب ہی میری طرف دیکھنے لگے
کہنے کو ہمکلام وہ تنہائیوں میں تھا

آواز دی تو سُن کے رُکا تک نہیں کوئی
ایسا گھِرا ہوا وہ تماشائیوں میں تھا

پھولوں کو کھلتے دیکھ کے یاد آ گیا کوئی
یہ زخم جیسے روح کی گہرائیوں میں تھا

تُو میرے در پہ آیا، پلٹ بھی گیا مگر
میں گم ترے خیال کی رعنائیوں میں تھا

ایّوبؔ ہم نے درد کا صحرا کیا عبور
نشہ سا ایک یاد کی پرچھائیوں میں تھا

اِک آئینے کی طرح مرے رُوبرو بھی ہو
اب چُور چُور سنگِ صداقت سے تُو بھی ہو

مہتاب ہے تو ابر سے باہر نکل کے آ
تُو عکس ہے تو نقشِ سرِ آبِ جُو بھی ہو

ایسا نہ ہو کہ وقت نکل جائے ہاتھ سے
تنہائی مل گئی ہے تو کچھ گفتگو بھی ہو

تو خُود ہی میری راہ کی دیوار بن گیا
میں کب یہ چاہتا تھا کہ مسمار تُو بھی ہو

ہم موم کے نہیں کہ پگھل جائیں دھوپ میں
حالاتِ حاضرہ پہ ذرا گفتگو بھی ہو

ایوبؔ رنگِ عہدِ تمنّا کہاں سے لائیں
کاٹیں اگر بدن۔ تو بدن میں لہُو بھی ہو

گئی رُتوں سے، نئے موسموں سے گزرے ہو
وہ تم، کہ یاد کے سب سلسلوں سے گزرے ہو

وہ میں کہ جس کو کسی دل میں بھی نہ راہ ملی
وہ تم کہ تیر کی صورت دلوں سے گزرے ہو

یہ کتنی دھول پڑی ہے تمہارے دامن پر
رہِ حیات میں کن مرحلوں سے گزرے ہو

بتا رہی ہے یہ آنکھوں کی منجمد لالی
کڑے دنوں سے کٹھن رتجگوں سے گزرے ہو

یہ اور بات، کسی موڑ پر کبھی نہ ملے
وگرنہ تم بھی انہیں راستوں سے گزرے ہو

یہ کیا، کہ آج سُبکسار ہو سرِ ساحل
کہ تم تو موج کی صورت سروں سے گزرے ہو

تہی تباؤ، نکالی ہے جوئے شیر کوئی
کہ تم تو تیشہ بکف پربتوں سے گزرے ہو

بُجھا بُجھا سا ہے چہرہ دھواں آنکھیں
خوشی کی کھوج میں کتنے غموں سے گزرے ہو

ملی نہ ایک بھی ایوب روشنی کی کرن
اگرچہ شب کے گھنے سلسلوں سے گزرے ہو

○

لوگ پتھر کے ہیں، آواز کا جادو بکھرے
نغمہ یوں چھیڑ کہ احساس کی خوشبو بکھرے

رات کی چپ تری سانسوں کی تھکن سے ٹوٹے
نغمگی بن کے ترے جسم کی خوشبو بکھرے

رات کے پچھلے پہر سرد ہوا شعلہ مزاج
صبح دم عارضِ گلنار پہ آنسو بکھرے

سلسلہ تیری بھی سوچوں کا سلامت نہ رہے
ٹوٹ کر میری طرح چاروں طرف تو بکھرے

لے گئی کھینچ کے سورج کو شبستاں کی کشش
شانۂ وقت پہ پھر شام کے گیسو بکھرے

ریزہ ریزہ ہُوا آئینۂ یکتائی بھی
جن کو خواہش تھی سمٹنے کی وہ ہر سو بکھرے

خاک سے پیار تھا، سو خاک میں مل کر ایوبؔ
میرا چہرہ، مری آنکھیں، مرے بازو بکھرے

○

تپتا ہوا صحرا تو بس اک بُوند کو ترسے
برسے بھی اگر ابر تو دریاؤں پہ برسے

اک پل کی مسافت تھی مگر ایسی تھکن ہے
لگتا ہے کہ لوٹا ہوں زمانوں کے سفر سے

اک عمر سے ہوں ذات کے زنداں میں مُقیّد
کوئی تو نکالے مجھے اُجڑے ہوئے گھر سے

آتی ہے ابھی تک کوئی مانوس سی آواز
دیتا ہے صدائیں کوئی خوابوں کے نگر سے

آنکھوں سے اُترتے ہی نہیں خواب کے منظر
شاید کبھی گزرے تھے اسی راہ گزر سے

وہ دیکھ کہ اب دیکھنے آیا تجھے دریا
تُو گھر سے نکلتا نہ تھا برسات کے ڈر سے

ایوبؔ اگر اس کو میں آنکھوں میں چھپا لوں
محفوظ رہے گا وہ زمانے کی نظر سے

بلا کی دھوپ میں وہ سائبان ہو جیسے
وہ ایک شکل کہ سارا جہان ہو جیسے

کچھ اس طرح سے مسلّط رہا کوئی ہم پر
ہمارے سر پہ تنا آسمان ہو جیسے

جو عکس عکس مری آنکھ میں بکھرنے لگا
ترا وجود بھی وہم و گمان ہو جیسے

کسی بھی بات پہ اب معترض نہیں کوئی
ہر ایک فرد یہاں بے زبان ہو جیسے

ترے بدن کی ہر اک شاخ پر گلاب کھلے
مرا یہ جسم کہ خالی مکان ہو جیسے

انا کے زعم میں جس کو کبھی گنوایا تھا
اب اُس کی سمت مری ہر اُڑان ہو جیسے

سحر ہوئی بھی تو ہم نے دیئے بجھائے نہیں
کہ جن کو آنا تھا اب تک وہ لوگ آئے نہیں

وہ چاند چہرے کہ اب تک بسے ہیں آنکھوں میں
وہ چند لوگ جو ہم نے کبھی بھلائے نہیں

کچھ ایسے لوگ بھی رہتے ہیں شہر میں یارو
جو دل میں بس نہ سکے آنکھ میں سمائے نہیں

یہ اور بات کسی سے کبھی گلہ نہ کیا
مگر وہ اشک جو ہم نے کبھی بہائے نہیں

ابھی تو زخم مہکنے کا موسم آئے گا
ابھی تو شاخِ تمنا پہ پھول آئے نہیں

لباسِ زخم بدن پر سجائے پھرتے ہیں
کچھ ایسے لوگ جو خوں میں کبھی نہائے نہیں

ہم ایسے دھوپ کے مارے جہاں میں رہتے ہیں
جہاں درخت تو ہوتے ہیں اور سائے نہیں

اُداسیاں تو مقدّر ہی بن گئیں ایوبؔ
وگرنہ ہم نے تو چہرے پہ دُکھ سجائے نہیں

پاؤں چادر سے نہ نکلے تو ہمارے نکلے
اپنی ہی ذات میں سب لوگ ادارے نکلے

چاند بھی سُرخ ہُوا یاد کی دہلیز پہ کل
ہجر کی شب میں لہو رنگ ستارے نکلے

ہم وہ سُورج کہ ہمیں اپنی شعاعوں نے ڈسا
اور دشمن بھی یہاں سائے ہمارے نکلے

ہم نے مفہوم کے دھاگوں سے انہیں باندھ لیا
جب کبھی ذہن سے سوچوں کے غبارے نکلے

میں نے چاہا تھا کہ شہکار تراشوں کوئی
سینۂ سنگ سے بھی خون کے دھارے نکلے

میں نے اک پھول کو چھونے کا ارادہ جو کیا
چشمِ شبنم سے گلستاں میں شرارے نکلے

روزنِ در سے جو کل جھانک کے دیکھا ہم نے
صفِ دشمن میں سبھی دوست ہمارے نکلے

روشنی بخشی ہے قرطاسِ ادب کو ایوبؔ
جس قدر لفظ لکھے چاند ستارے نکلے

○

پہلے ہمارے خوں سے اُجالے کئے گئے
پھر ہم ہی ظلمتوں کے حوالے کئے گئے

سچ بولنے کے جرم میں کاٹی گئی زباں
پیوست اپنے جسم میں بھالے کئے گئے

یوں بھی ہوا کہ پیاس بجھانے کے واسطے
پُر اپنے ہی لہو سے پیالے کئے گئے

سینے میں آرزو کے دھماکے ہُوا کئے
کتنے پہاڑ روئی کے گالے کئے گئے

یہ حادثہ بھی ہم سے ہوا دل کی موت پر
آہیں بھری گییٔں کبھی نالے کیۓ گۓ

گلشن کا رنگ اپنے لہو سے فزوں کیا
صحرا کی نذر پاؤں کے چھالے کیۓ گۓ

مرنے سے پیشتر ہی ہمیں موت آ گیٔ
ہم جیتے جی زمیں کے حوالے کیۓ گۓ

ایوبؔ ہم چکور نہ تھے اس کے باوجود
ہم پر ہی تنگ چاند کے ہالے کیۓ گۓ

چمک تھی جس سے وہ رنگِ شباب ختم ہوا
اُجڑ کے رہ گئی خوشبو گلاب ختم ہوا

اُمید سوہنی بن کے نہ اس میں تیر سکی
کہ میرے دل میں لہو کا چناب ختم ہوا

چُھپا تھا چاند ستاروں کے درمیاں کوئی
اُسی پہ جا کے مرا انتخاب ختم ہوا

اُجالے بانٹ چکا تو سبھی نے مجھ سے کہا
بکھر گئیں تری کرنیں شباب ختم ہوا

نسیمِ صبح نے ہر ایک پنکھڑی کو ڈسا
کہ زہر بن گئی شبنم گلاب ختم ہوا

نکل کے آ گئی پتھر کی قید سے تصویر
جو آئی سامنے تعبیر خواب ختم ہوا

ابھی تو ترکِ محبت کی رسم باقی ہے
ابھی سے کیسے یہ سمجھیں عذاب ختم ہوا

کچھ اور لوگ ابھی میرے بعد آئیں گے
کہو نہ حق و صداقت کا باب ختم ہوا

ہم اس کے واسطے جاں سے گذر گئے ایوبؔ
تمام قرض چکایا، حساب ختم ہوا

○

دُعا یہ مانگ کہ راس آئے نغمگی مجھ کو
خدا عطا کرے آہنگِ خسروی مجھ کو

یہ اور بات اُٹھایا ہے فائدہ سب نے
نہ راس آئی تو خود میری سادگی مجھ کو

وہ میں نے جس کو رکھا اپنی جان و دل سے عزیز
وہی نہ سونپ سکا اپنی زندگی مجھ کو

میں خود سری کا لبادہ پہن نہیں سکتا
کہیں گھٹا نہ دے تیری برابری مجھ کو

اسی لئے تو میں سانپوں سے پیار کرتا ہوں
کہ دوستی ہی میں ڈستا ہے آدمی مجھ کو

جہاں تھے پھول کبھی اب وہاں ہے سناٹا
غُبار لگتی ہے گلشن کی تازگی مجھ کو

یہ اور بات کبھی چین سے میں سو نہ سکا
ملی تھی زلف کی چھاؤں تو ریشمی مجھ کو

گزر گئیں کئی صدیاں پلک جھپکنے میں
بڑی طویل لگی اس کی گھڑی مجھ کو

میں بے خبر تو نہیں اپنے گرد و پیش سے ایوب
نظر تو ڈالنا پڑتی ہے سرسری مجھ کو

گیت

اپرم بھید بتاؤں اپرم بھید بتاؤں تم کو

اندھیاری راتوں میں بیٹھی انسوؤں دیپ جلاؤں
آپ ہی ساری کے پلو سے جلتے دیپ بجھاؤں
کبھی میں بن کر راگ برہا کا کانوں میں بس گھولوں
کبھی میں بن کر گیت ملن کا امرت رس برساؤں
سپنوں میں کھو جاؤں اپرم بھید بتاؤں تم کو

آپ ہی پاؤں سکھ ہردے کا آپ ہی اس کو کھوؤں
من مندر کو کر کے سونا آپ ہی بیٹھی روؤں
آپ چنوں میں کلیاں اور پھر آپ ہی کانٹے بوؤں
آپ بچھاؤں سیج پہ اُن کو آپ ہی اس پر سوؤں
پھر بھی چین نہ پاؤں - اپرم بھید بتاؤں تم کو

سوچ سوچ کر تھک جاؤں راہ نہ کوئی پاؤں
جیت جیت کے پیار کی بازی آپ ہی ہارے جاؤں
کہوں کو تیا پیار کی اپنی آپ ہی بیٹھی گاؤں
جگ کو اپنا بھید بتاؤں اور پاچھے پچھتاؤں

فسدن نیر بہاؤں اپرم بھید بتاؤں تم کو

قطعات

جو رات کل تری آغوش میں گزاری ہے
وہ رات ہستیِ جاوید پہ بھی بھاری ہے

جسے میں خود کبھی الفاظ میں سمو نہ سکوں
وہ کیف میرے تصوّر پہ اب بھی طاری ہے

○

تونے کل مجھ سے جو اے جان کئے تھے وعدے
وہی وعدے مرے جینے کا سہارا ہونگے

وقت نے اُن کو اگر مجھ سے کبھی چھین لیا
دیدہ و دل نہ سکوں یاب دوبارہ ہونگے

دُکھ بھری لَے میں کوئی دوشیزہ
جب کبھی ماہیا سناتی ہے

یک بیک دُور تک فضاؤں میں
اِک اُداسی سی پھیل جاتی ہے

○

مدّتیں ہو گئیں بُھلائے ہوئے
ان محبت بھرے اشاروں کو

اے غمِ دوست اب فریب نہ دے
میں نے ٹھکرا دیا سہاروں کو

○

اپنے سائے سے تو نہ بھاگ میں سایہ ہوں ترا
تو جہاں جائے گا مجھ کو بھی وہاں پائے گا

مجھ سے بیگانگی لے جائیگی جب دُور تجھے
تو مجھے اور قریں اور قریں پائے گا

اپنی ناقدر شناسی سے خفا ہو ہو کر
میری مرحوم وفاؤں کی قسم کھاؤ گے

جب پرستار نہ ہو گا تو خدائی کیسی
آج جو سنگ ہے کل اس کو جبیں پاؤ گے

○

کچھ روز سے حیات میں بے کیفیاں سی ہیں
اب درد میں وہ پہلی سی لذّت نہیں رہی

وہ التفات ہے نہ وہ پیہم نوازشیں
شاید کسی کو میری ضرورت نہیں رہی

○

دھجیاں جسم کی سیتے ہوئے ڈر لگتا ہے
جینا چاہوں بھی تو جیتے ہوئے ڈر لگتا ہے

زندگی سم نہ سہی بادۂ گلگوں ہی سہی
جانے کیوں جام یہ پیتے ہوئے ڈر لگتا ہے

یہ تیرے گیسوئے برہم یہ حسن کے سائے
انہیں سے اُلجھے ہوئے دل کے ہاتھ رہتے ہیں

جو بدنصیب ہیں اُن کا نصیب کیا کہنا
جُدا بھی رہ کے ترے ساتھ ساتھ رہتے ہیں

○

جس کی تعبیر اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک مدّت ہوئی اک خواب حسین دیکھا ہے

جب کبھی رہ میں کوئی ماہ جبیں ملتی ہے
سوچتا ہوں اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

○

پینے والے سمجھ نہیں سکتے
تشنگی میں جو اک خمار سا ہے

ہے ترے پیار میں وہ بات کہاں
بے رُخی میں جو ایک پیار سا ہے

نیند آنکھوں سے بہت دُور چلی جاتی ہے
جب خیال آتا ہے اکثر شب تنہائی میں
جتنا تو کھینچتا ہے دل تری طرف کھینچتا ہے
کون سا جذب ہے ایسا تری رعنائی میں

○

اپنی مجبور تمناؤں پہ ہنس دیتا ہوں
لوگ جب پوچھتے ہیں مجھ سے یہ حیرانی سے
وہ کہ تم بن جنہیں اک سانس تھا لینا دشوار
کس طرح بھول گئے اسقدر آسانی سے

○

مجھے قسم ہے ترے گیسوئے پریشاں کی
تمام رات ستاروں سے گفتگو کی ہے
سکوں نہ چاند نے بخشا نہ ابر پاروں نے
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈا ہے جستجو کی ہے

اپنے ناکردہ گناہوں کا سہارا لے کر
رنگ بھرتا ہوں میں یوں زیست کے افسانے میں
اپنے شہکار کو جس طرح مصوّر کوئی
خونِ دل بھر کے سجاتا ہے صنم خانے میں

○

بجھی بجھی سی جوانی کو دیکھ کر اپنی
سیاہ راتوں میں اکثر خیال یہ آیا
وفا شناسی تو اس کی فریب تھی لیکن
سوال یہ ہے کہ میں نے فریب کیوں کھایا

○

زندگی کے اُداس معبد میں
چند یادوں کے بُت سجاتا ہوں
کتنا شیریں ہے خواب بے تعبیر
میں انہیں اب بھی یاد آتا ہوں

رباعیات

سورج کی طرح دُور اندھیرا نہ کیا
تو نے مری قسمت میں سویرا نہ کیا
وہ پھول ہوں دُنیائے چمن کا ایوب
جس پھول پہ شبنم نے بسیرا نہ کیا

○

چڑھتے ہوئے سورج کی جوانی میں ہوں
بہتے ہوئے دریاؤں کا پانی میں ہوں
پڑھنا ہے اگر، تو میرے چہرے کو پڑھو
اس دور کی اک زندہ کہانی میں ہوں

جب بھی کوئی استھائی سنی سوچا ہے
کیوں راگ کی دُنیا میں مرا سکّہ ہے
ایوب مجھے سُر نے چڑھایا پروان
میں اس کا ہوں خادم وہ مرا آقا ہے

○

سُورج کو چراغ ایسا دکھایا میں نے
اوڑھا ہے ہر اک گام پہ سایا میں نے
ہر نسل کے دامن میں گرائے گا ثمر
وہ پیڑ سرِ راہ لگایا میں نے

لکشن گیت

ایمن

دیپ جلے اور جاگا ایمن
نی۔رے۔گا۔رے۔گا۔رے۔نی۔سا

خسرو نے جس کو اپنایا
مُرشد کے بھی در پر گایا
وار دیا تھا اپنا تن من
دیپ جلے اور جاگا ایمن

گا دادی اور نی سمبوادی
صورت دِلکش سیدھی سادھی
بہلا دے اس کے من موہن
دیپ جلے اور جاگا ایمن

دیپک

کیسی ہا ہا کار مچی ہے
من کی اگنی جاگ اُٹھی ہے

آج یہ کس نے دیپک گایا
"پا" اور "رے" کو صاف دکھایا
اور نکھاد چھُپی ہے

کیسی ہا ہا کار مچی ہے

کیا کیا قصّے دھیان میں آتے
چھ سُر، یوں کلیان میں آتے
اک تصویر بنی ہے

کیسی ہا ہا کار مچی ہے

ہنڈول

پیار ہنڈولے جھُولے پیار
پیار ہنڈولے جھُولے پیار
اوڈو سُرگنی جب گائیں
وادی سمواد ی بن جائیں
دھیوت اور گندھار
پیار ہنڈولے جھُولے پیار

جب کلیان میں "رے" "پا" چھوڑیں
وِکر سُروں سے ناطہ جوڑیں
اس کے مارگ ہونے سے کون کرے انکار
پیار ہنڈولے جھُولے پیار

شدھ سارنگ

اس کی ساری ادائیں پیاری اس کا اُجلا رُوپ
دونوں مدّھم یوں لگتے ہیں جوں جاڑے کی دُھوپ

اوڈو کھاڈو چال ہے اس کی رکھب سُر ہے وادی
جس نے "پا" سموادی کر کے دھیوت خوب جگادی
سامنے کھل کر آجاتا ہے اس کا روپ سروپ
دونوں مدّھم یوں لگتے ہیں جوں جاڑے کی دُھوپ

سا، رِ، ، پا، نی، سا، جا کر بن جاتا ہے گیت
رنگ برنگ سارے سارنگ اس کے پکے میت
لیکن اُن میں سب سے الگ ہے اس کا روپ انوپ
دونوں مدّھم یوں لگتے ہیں جوں جاڑے کی دُھوپ

بہاگ

پی کی یاد ستائے
پی نہیں لوٹ کے آئے

اوڈو ہے آروہی اس کی سمپورن امروہی
'سا' سے 'نی' تک جاتے جاتے رکھب دھیوت کھوئی
من دنیا کے تار اُتر گئے کچھ نہ جی کو بھائے
پی نہیں لوٹ کے آئے

من کے روگ نے لی انگڑائی نِندیا ہوئی پرائی
'گا' گا کر جب اک برہن نے 'نی' کی جوت جگائی
آگ لگی سینے میں ایسی نیناں جل برسائے
پی کی یاد ستائے

ہنس دھن

شبھ گھڑی ملن کی آئی مِتوا

اوڈو راگ میں بیٹھی گاؤں
گاؤں گا گا جی بہلاؤں
مدھر مدھر سی اک استھائی
شبھ گھڑی ملن کی آئی مِتوا

سا، رے، گا، پا، نی، سا، چھیڑوں
مدھم دھیوت سے منہ موڑوں
من میں باج اُٹھے شہنائی
شبھ گھڑی ملن کی آئی مِتوا

آروہی امروہی نیاری
سرگم جس کی پیاری پیاری
سُن کے آ جائے انگڑائی

شبھ گھڑی ملن کی آئی مِتوا

چاندنی کیدارا

باج رہی ہے من کی بینا

سُن کے جس کی تانیں پیاری
جُھوم اُٹھے جیون پھلواری
راس آجائے جینا
باج رہی ہے من کی بینا

دونوں مدھم اور نکھادیں
بنیں سُروں کی جب بنیادیں
چھلنی ہوئے سینا
باج رہی ہے من کی بینا

مدھم وادی سُر سمو ادی
چلت پھرت کی ہو آزادی

سا۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھی۔ نا
باج رہی ہے من کی بینا

کوشک دھنی

راگ سُہانا گاؤ آؤ کوشک دھنی رچاؤ

مدّھم اس کا کرکے وادی سُا، سمواد بناؤ
رکھب پنچم چھوڑو دونوں اوڈو آؤ جاؤ
سپنوں میں کھو جاؤ
راگ سُہانا گاؤ

اس کا روپ سروپ انوکھا اس کی چھب ہے نیاری
اس کی چال ہے سیدھی سادھی صورت پیاری پیاری

سب کا دل برماؤ
راگ سُہانا گاؤ

بھیروں

دُور ہُوا اندھیارا جگ کا
بھیروں روشنی لایا
اُترانگ کی دھیوت وادی اور رکھب سموادی
سات سُروں میں گائیک نے جب دھیوت رکھب ڈھلا دی
دُور ہُوا اندھیارا جگ کا
بھیروں روپ دکھایا

جگ مگ کرتی اس کی تانیں اور سنجیدہ صُورت
دن کے شبھ کاموں کی گائیک اس سے کرے مہُورت
مارگ بنا بنایا
بھیروں روشنی لایا

للت

بھور بھئی اور پنچھی بولے
بھیروں ٹھاٹھ کا کھاڈو راگ
دیں جب "ما" اور "دھا" کی لاگ
کانوں میں رس گھولے
بھور بھئی اور پنچھی بولے
شدھ مدھم اور "سا" کا سنگ
اترانگ کا اُجلا رنگ
گاتیک کے سنگ ہولے
بھور بھئی اور پنچھی بولے

میاں کی ٹوڈی

میاں نے ایسی ٹوڈی گائی
محفل پر مدہوشی چھائی

آروہی کو کھاڈو جا کر
امروہی سمپورن آکر

"رے" اور "دھا" کی راس رچائی
محفل پر مدہوشی چھائی

البیلی پرُوانگ کی جوگن
گورا گورا جس کا تن من

بن ٹھن سامنے آئی
میاں نے ایسی ٹوڈی گائی

ملتانی

مدھ نائیک کے گھر کی رانی
ٹوڑی ٹھاٹھ کی یہ ملتانی
"ما" اور "گا" کو خوب جھلائیں پنچم کر کے وادی
اوڈو اور سمپورن ہے یہ صورت سیدھی سادھی
مُرشد کا پیغام ہے اس میں دُنیا آنی جانی
ٹوڑی ٹھاٹھ کی یہ ملتانی
"اللہ جانے" "مولا جانے" جھوم جھوم کے گائیں
"رے" کے کن کو دیکھ کے رُوٹھے مرشد بھی من جائیں
اس کے سارے سُر سُریلے اس کی میٹھی بانی
ٹوڑی ٹھاٹھ کی یہ ملتانی

درباری

آشاؤں نے گھونگھٹ کھولے

من چاہے درباری گاؤ   خوشیوں کا دربار سجاؤ

جو گائے   سو   موتی   رولے
آشاؤں   نے   گھونگھٹ کھولے

راگ وِکر پر ہو سمپورن 'گا' اور دھا دونوں آندولن

جیسے   نیّا   لے   ہچکولے
آشاؤں نے گھونگھٹ کھولے

شدھ بھیرویں

سُندر چنچل اور البیلی بھیرویں ٹھاٹھ کی جائی
پائل سے نغموں کو جگاتی سدا سہاگن آئی

"سا" اور "پا" کی سنگت اس کی صورت سدا سجائے
جمنا کے پنگھٹ پہ بیٹھی نینن بان چلائے
چال اس کی بل کھاتی پیاری سب کے من کو بھائی
پائل سے نغموں کو جگاتی سدا سہاگن آئی

رتیاں باہر کاٹ کے ساجن جب گھر لوٹ کے آئے
اس کی سجری سیج کو دیکھے کرنی پر پچھتائے
پھر نہ اس کے من کو بھائے سوتن کی چترائی
پائل سے نغموں کو جگاتی سدا سُہاگن آئی

مالکونس

آؤ گائیں راگ سکھی ری
رل مل گائیں راگ

"رے" "پا" چھوڑیں اوڈو جائیں
بھیرویں والے سُر لگائیں

"ما" "نی" کی جب جوت جگائیں
جاگیں سوئے بھاگ
رل مل گائیں راگ

امروہی بھی اوڈو اُس کی
سیدھا صاف سُروپ

ورجت سُر کا گن دے دے کر
اور نکھاریں رُوپ
اس میں پی کے ملن کی مدّرا
اور برہا کی آگ

آؤ گائیں راگ سکھی ری
رل مل گائیں راگ

سری راگ

ساجن لوٹ کے آیا
پوربی ٹھاٹھ میرے من بھایا

ساجن لوٹ کے آیا

"گا" اور "دھا" سے بچکر جاؤں
امروہی سمپورن آؤں

سُکھ ہردے کا پایا
ساجن لوٹ کے آیا

"رے" اور "پا" نے جوت جگائی
پیتم بھول گیا چترائی

ہر جائی پچھتایا
ساجن لوٹ کے آیا

سوہنی

سوہنی صُورت اور من مُورت تارستان کی رانی
مارواٹھاٹھ میں پنچم غائب چُنری اُس کی دھانی
"دُھا" اور "گا" کی سنگت میں جب تارستان میں جائیں
جوں جوں بھیگے رات تو اس کے سُر تازہ ہو جائیں
پُوریا کو یہ نیچے بٹھاتے آپ کرے من مانی
آنکھوں میں بھر لاتے پانی تارستان کی رانی

"پی کہاں" کا درد ہے اس میں اور کوئل کی کوک
سب کے دلوں میں یوں اُترے ہے جوں برہن کی ہوک
درد کے مارے چھم چھم روئیں سُن سُن اس کی بانی
آنکھوں میں بھر لاتے پانی تارستان کی رانی

تلنگ

یہ گبھرو پنجاب کا یہ لج پال جوان
اس کو جان سے بھی پیارا ہے اپنا تیر کمان
دریا پانچ پنجاب کے، اس کے سُر بھی پانچ
لیکن اِن میں دبی ہوئی ہے ہلکی ہلکی آنچ

صاحباں اُس کی جان تھی اُور گانی اِس کی جان
یہ گبھرو پنجاب کا یہ لج پال جوان

اس کے تیر سے چھلنی ہو کر "رے" "دھا" جان سے گزرے
جنجھوٹی کھمّاج سے بچ کر یہ اِس شان سے گزرے
جیسے وہ تو نربل ہوں اور یہ بڑا بلوان
یہ گبھرو پنجاب کا یہ لج پال جوان

گونڈ ملہار

کاری بدریا چھم چھم برسے
پی دیکھن کو جیارا ترسے
کاری بدریا چھم چھم برسے

بوندنیوں کے ساز پہ گائیں آؤ گونڈ ملہار
رسے، کے سنگھاسن پر بیٹھی مدھم کرے سنگھار
چھُپ چھُپ اپنے گھر میں بیٹھی، نی بجلی کے ڈر سے
کاری بدریا چھم چھم برسے

رم جھم تال پہ برکھا رانی راگ سہانا گائے
جھل تھل دیکھ کے پاپی من میں رہ رہ کر یہ آئے
سوکھی اپنے من کی بگیا ایک بوند کو ترسے
کاری بدریا چھم چھم برسے

پیلو

من ساگر کی لہروں پر اک ناؤ بہتی جائے

اس میں بھیرویں بھیم پلاسی اور گوری کا رنگ
صورت اس کی سمپورن ہے مشیر میل کا انگ
ناؤ جوں جوں آگے جائے دوری بڑھتی جائے
من ساگر کی لہروں پر اک ناؤ بہتی جائے
"گا" اور "نی" کی سنگت میں سب تیور سُر ہی جائیں
امروہی میں واپس آتے کومل کر کے آئیں
پی بن کون بھلا برہن کے من کی دھیر بندھائے
من ساگر کی لہروں پر اک ناؤ بہتی جائے

باگیشوری

آؤ رات کی راگنی گائیں
برہا کا اک رُوپ دکھائیں
سا۔ گا۔ ما۔ دھا۔ نی۔ سا۔ جائیں
امروہی سمپورن آئیں
آؤ رات کی راگنی گائیں

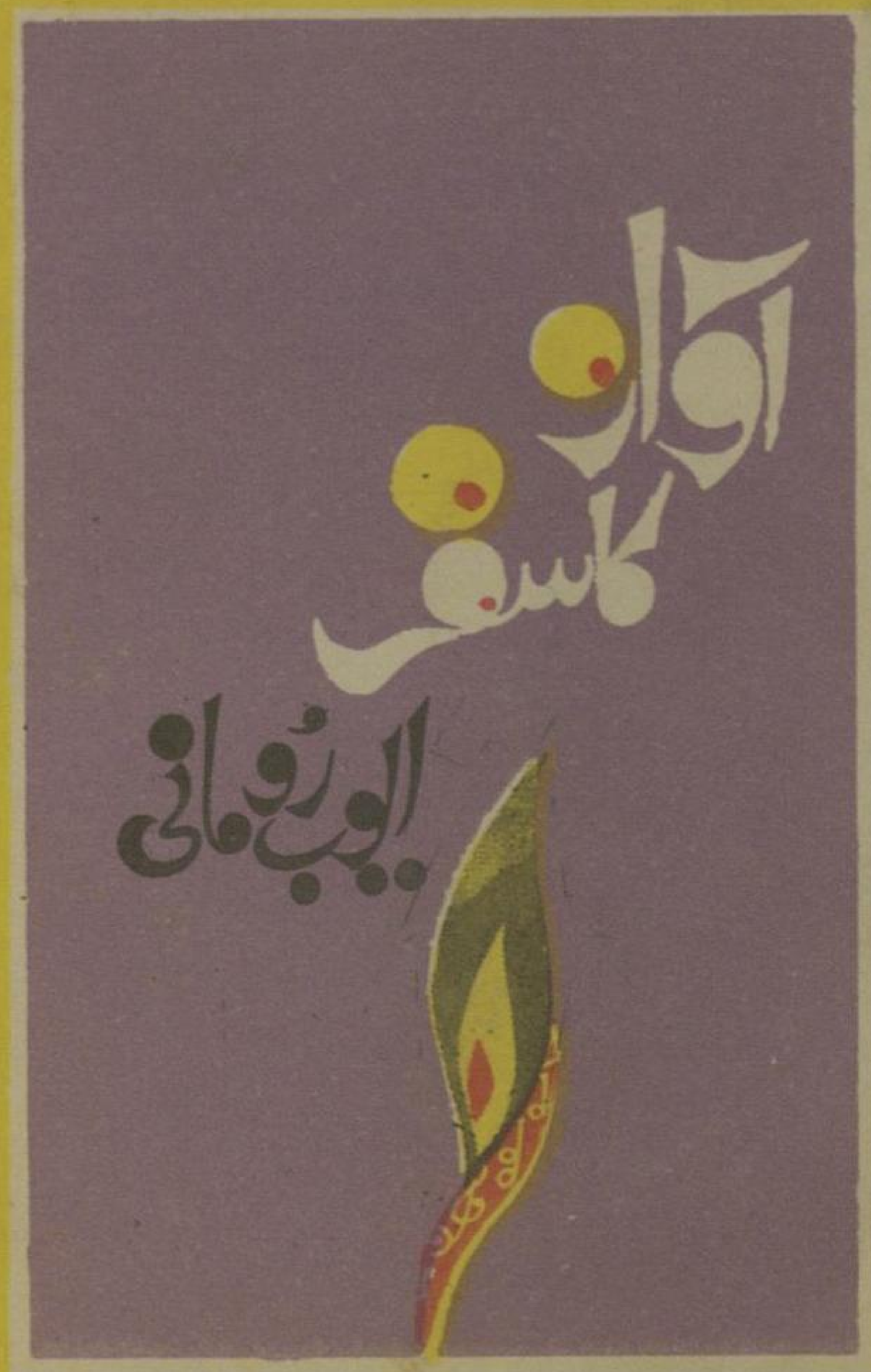
مدھم کھرج کی سنگت نیاری
مہک رہی ہو جوں پھلواری
جیون جوت جگائیں
آؤ رات کی راگنی گائیں

میگھ

گِھر گِھر آتے بادل کالے
گا لے منوا میگھ تُو گا لے

مدھ اور مندر ستان کا راجہ
اوڈو جا اور اوڈو آ جا
رکھب خوب جگا لے
گا لے منوا میگھ تُو گا لے

"سا" راجہ اور پنچم رانی
کن گندھار کی ہو انجانی
"ما" اور "رے" کی راس رچا لے
گا لے منوا میگھ تُو گا لے



"آواز کا سفر" کتاب شاعری کی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شاعری میں جادو ہے اور جادو جگانے والے ہیں "ایوب رومانی" — ایوب رومانی پچھلے کئی برسوں سے ریڈیو پاکستان میں نوکری کر رہے ہیں۔ پروگرام تخلیق کرنے سے نوکری کے سفر کا آغاز کیا اور آجکل کمرشل سروس میں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن جب "شاہ کے مصاحب" بنے تو اِترانے لگے۔ یہ شاہ وہ نہیں ہے جو نوکری دیتا ہے بلکہ یہ موسیقی کا شاہ ہے جو عام طور پر نوکری چھڑواتا ہے۔ ایوب رومانی اپنے آپ کو اسی شاہ کا مصاحب کہتے ہیں۔ راگ سنتے جو شکل ذہن میں بنتی ہے انہوں نے وہی صورت دلکش گیت لکھ کر دل میں اُتار دی ہے۔ یقین مانئے یہ کام بڑے دل گردے کا ہے اور اردو شاعری میں بالکل نیا ہے۔